چہار خواب
قمر جمیل

قمر جمیل شعر گوئی کے میدان میں جدیت کے نہیں بلکہ جدت کے پرستار ہیں وہ نئے سے نئے تجربے نظم گوئی کے میدان میں کرتے رہے ہیں، مگر وہ پابند شاعری بالخصوص غزل گوئی کو خاص اہمیت دیتے ہیں جس کا ایک رشتہ ہر صورت میں روایت سے قائم رہتا ہے۔ اُن کے تازہ مجموعۂ کلام "چہار خواب" میں غزلوں کی تعداد ان کی نثری نظموں اور آزاد نظموں سے زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں قمر جمیل کو جدید غزل گوئی ہی کا ایک شاعر تصور کیا جائے گا۔ جدید غزل، یہ ترکیب حالیؔ نے خود ایجاد کی اور وہی جدید غزل کے موجد مانے جاتے ہیں۔ لیکن دَورِ حاضر کی جدید غزل حالیؔ کی جدید غزل سے بہت مختلف ہے۔ اس دَور کی جدید غزلوں میں اتنے بہت سے رجحانات ظاہر ہو رہے ہیں کہ کسی ایک رجحان کو نمائندہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ وہ ابھی کچھ تشکیلی صورت میں بھی ہے۔ ہندوستان میں اس کا رنگ جدا، پاکستان میں اس کا ڈھنگ قدرے مختلف ہے۔ اور پھر ہر غزل گو کا رنگ شاعری جدا، یہی انفرادیت ان کی پہچان بھی ہے، آج کے جدید غزل گو شعرا کو جن غموں نے گھیر رکھا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ بے گھری کا غم، ہجرت کا غم، سیاسی جبر اور ظلم و ستم کا غم، ناقدریٔ زمانہ، بیگانگیٔ خلق کا غم، تنہائی اور زندگی کی بے کیفی کا غم ـــ اور پھر وہ غم جو غالبؔ کو شبِ ہجر میں تھا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

قمر جمیل کو بھی اگر یہ سب نہیں تو ان میں سے کئی غم لاحق ہیں مگر ان کا طرزِ بیان منفرد اور نرالا ہے۔ گفتگو خواب کی ہے مگر اُن کا حُسنِ بیان جاگتے خوابوں کی تصویر کا ہے

جاگ رہے ہیں خواب میں بھی   نیند میں بھی ہے نیند حرام

اُن کے اس طرزِ بیان میں زندگی کے اس شعور کی روشنی ملتی ہے جو خواب کو حقیقت میں تبدیل کرتی ہے۔ ان کے بیان میں دھند کی کوئی فضا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے ان کا خواب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں شکلیں تو دیکھی جا سکتی ہیں لیکن ان شکلوں کو ہاتھ لگانا مشکل ہے

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کو دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے، ہاتھ لگانا مشکل ہے

رات دریا آئینے میں اس طرح آیا کہ میں
یہ سمجھ کر سو گیا۔ دریا نہیں اک خواب ہے

قمر جمیل کا یہ فن آئینہ در آئینہ ہے، وہ خود تو آئینے سے باہر ہیں لیکن اُن کا خواب آئینے میں ہے۔ روشن اور غیر مبہم کیوں نہ ایسا ہو جبکہ وہ دردِ انسانیت کو دینِ سخن تصور کرتے ہیں

ہم کہ آرائشِ فن جانتے ہیں
درد کو دینِ سخن جانتے ہیں

ممتاز حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کس تعلّق سے تجھ کو دیکھتے ہیں
ہم کہ ہیں پائمالِ عمرِ رواں

قمر جمیل

قیوم احمد فاروقی کے نام

(جواں مرگ بھائی جان)

ہماری روح کے ستارے بابل کے میناروں
سے گرتے ہوئے یہ نہیں دیکھ سکے کہ یہ بابل نہیں
ہے یہاں گھر سے گھر تک ابدیت ایستادہ ہے،
بجلی کے تاروں سے کوّے گھروں میں جھانک
رہے ہیں۔ بھائی جان میں خواب دیکھنے اور
نیند میں چلنے سے باز نہیں آسکتا، میں اپنے
یہ چہار خواب آپ کے نام انتساب کر رہا ہوں
آج میں آپ کو اپنے ساتھ لئے بغیر گھر نہیں
جاؤں گا۔

قمر جمیل

کتابت ـــــ غلام محی الدین

قیمت ـــــ [illegible] روپے

اشاعت ـــــ اوّل ۱۹۸۵ء

تعداد ـــــ ایک ہزار ایک سو

پرنٹر ـــــ

پبلشر ـــــ مکتبۂ آسی

اے۔ ۱۵۔ یو کے پلازہ پہلی منزل

نزد عرشی سینما کراچی

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

اُس کے قدم سے پھول کھلے ہیں یہ سنا ہے چار طرف
ویسے اس ویران سرائے میں پھول کھلانا مشکل ہے

قمر جمیل

ہم نے کچھ لوگوں کی تصویر اُتاری ہے جمیلؔ
اور کچھ لوگ چُھپا رکھّے ہیں آئینے میں

فہرست

غزلیں

چہار خواب

(۱)

حلقۂ یاراں میں کنعاں رات کے پچھلے پہر
بستیوں سے دُور نہروں کے کنارے خیمہ زن
حلقۂ یاراں میں کتنے نازنیں نازک کمر

(۲)

رقص کے ہنگام اُبھر آتے ہیں کتنے شوخ رنگ
اور کتنے تیز ہو جاتے ہیں نظروں کے خدنگ
یہ نظر کے سامنے کتنے ہی عالَم خواب سے

(۳)

رسم ادا ہونے نہ پائی تھی کہ خیموں کے قریب
شہ نشیں کی سمت دوڑے اس طرح وحشی نقیب
کتنے ارماں کتنے غم اشکوں میں ڈھل کر رہ گئے
عین جشنِ رسم کے ہنگام کنعاں کا گریہ

(۴)

یہ قبیلوں کے شیوخ پختہ عمر و جانفروش
وادیٔ دجلہ کے شہری کُرد کے خانہ بدوش
لڑ رہے ہیں اپنی اپنی کج کُلاہی کے لئے

گرمیٔ گفتار سے ممکن نہیں دِل کا رفو
گفتگو سے اور بڑھ جاتا ہے جوشِ گفتگو

دجلہ کے خواب

دیکھو ساحل کے نظارے آبِ دریا پر چلے
وہ قبیلہ کے جواں پھر ہوش سے باہر چلے
یہ ادائیں رقص کے ہنگام کتنی رقص خیز
کاکلوں کے سنبلستاں عارضوں پر عکس ریز

رقص میں یہ لڑکیاں پھر آگ کے اطراف یوں
جیسے اک گرداب میں کچھ موجہائے سیمگوں

مِل کے جب جھکتی ہیں لگتی ہیں کلی مُنہ بند سی
اور جب تنتی ہیں کس درجہ بھلی دِلبند سی

شعلہ افشاں کاکلوں میں سرخ پھولوں کے چراغ
جیسے تاریکی میں مِل جائیں اجالے کے سراغ

کر رہے ہیں رقص دف پر مہوشانِ جلوہ تاب
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں وادیٔ دجلہ کے خواب

ایک منظر

یہ امیرانِ قبیلہ کے سموروں کے لباس
درمیانِ حلقۂ روشن شمع سائے آس پاس
شہ نشیں پر جلوہ فرما یہ شیوخ ہوشمند
جن کی دنیا دیوتاؤں کی پرستش سے بلند

ان کے آگے رقص کرتا آرہا ہے ایک غول
جن کی وحشی گردنوں میں مختلف رنگوں کے بول

ہم بادِ بہاری ہیں کبھی آ کے ترے پاس
اے دوست تجھے نیند سے بیدار کریں گے

میری محبت چاہتی ہے

میری محبت چاہتی ہے مینارے گھر کے شوالوں کے
کچھ باتیں مکّے والوں کی کچھ قصّے بنارس والوں کے

میری تمنّا سورج بن کے چمکتی ہے گلزاروں پر
میری محبت سایہ بن کے ٹھہرتی ہے دِلداروں پر

روشنی میری بلندی بن کے چمکی چاند ستاروں میں
میں نے گلاب کی آنکھیں دیکھیں اپنے گھر کی بہاروں میں

میرے لئے تہوار کی راتیں اب بھی دیئے جلاتی ہیں
میرے لئے ہر دیس کی یادیں اب بھی ناچنے آتی ہیں

میں اپنے ہی خواب کا دیا ہوں
اور اپنے ہی گھر میں جل رہا ہوں

آخری سلام

ناچ ناچ کے سارے پتّے ساری کلیاں گر جائیں گی
اور کہیں سے تیز ہوائیں ان کو اُٹھانے آئیں گی

سورج ان کی سرد چِتا میں آگ لگانے آتے گا
جاؤ جاؤ ان کلیوں کو آخری بار سلام کرو
پھر اپنا یہ ناچ نہ جانے ہم کو کہاں لے جائے گا

تمھاری آنکھ میں غم کی نمی ملی ہے مجھے
کنول کے بیچ عجب روشنی ملی ہے مجھے

دعا

یہ دعا ہے کوئی گلہ نہیں
مرے ہمنشیں مری زندگی
وہ گلاب ہے جو کھلا نہیں

میں یہ سوچتا ہوں خدا کرے
تجھے زندگی میں وہ سُکھ ملے
جو کبھی مجھے بھی مِلا نہیں

تیری محبت میرے دل میں ایسے جادو جگائے
جنگل کی اک جھیل میں جیسے سورج آگ لگائے

یوسف

نازک ابرو نازک مژگاں
دامن شیشہ زلفیں سائے

ہیرے موتی بن کے آنسو
چشمِ زلیخا میں لہرائے

یوسف جیسا پیغمبر بھی
اس کی محبت سے گھبرائے

ابھی تو مٹی پہ چل رہے ہو
ستارہ بن کر نکل نہ جانا

منصور حلاج

میری آنکھیں میری جان
تیرا عبادت خانہ
اور اپنے لئے اک نارِ جحیم
میرا دل ہرنوں کے لیے
میدانِ عظیم
اور اپنے لیے اک خانۂ بیم

دیکھ ذرا حلاج کا رقص
جس نے اپنی مٹی
اپنا خون
نہ سمجھا اپنا خون
جس کے لیے لایا ہے کوئی
ایک وصالِ دوام
ایک چراغِ مبین

نیل کا سیلاب

یہ محل یہ نقیب یہ خدّام
اور یہ شمعدان یہ گلفام

سائے کی طرح شمعدان کے ساتھ
ایستادہ وہ دست بستہ غلام

نیلگوں پیرہن میں خواجہ سرا
پردۂ در پہ ارغوانی جام

نقشِ دیوار مانی و بہزاد
پابہ زنجیر رستم و بہرام

طاقِ ایواں میں جھلملاتی ہوئی
روشنی کچھ کبود کچھ گلفام

آئینوں میں وہ پیرہن زرتار
سرسراتی ہوئی ادائے خرام

وہ زمرّد کی کشتیوں میں دھواں
عود میں بس گئے ہوں جیسے مشام

رات کاکُل کی ہر شکن میں اسیر
آنکھ پر نورِ آفتاب حرام

تاج میں دامنِ گہر غلطاں
تخت پر کاوشِ ہنر بے خواب
ناگ کی طرح پیچ کھائے ہوئے
وہ عصائے شہنشہی بے تاب
وہ حبش کے غلام پر قنداز
جیسے فرماں رواؤں کے آداب
خنجرِ خونفشاں لئے جلّاد
ابنِ آدم کے خون سے سیراب

نازِ شیریں کا آئینہ دیوار
دستِ فرہاد کی طرح محراب

تارِ مطرب میں ناوکِ پُر فن
مغبچے ہاتھ میں لئے زہراب

صندلیں کرسیوں پہ جلوہ طراز
سرزمینِ عراق کے مہتاب

زرد گوہر کی طرح دامن میں
دیکھو بغداد کے حَسین گلاب

تخت پر کوئی ایسے جلوہ فگن
خواب میں جیسے حکمراں کہلائے
اور چاہے کہ صحبتِ شب کو
ہر قبیلہ سے شہرزاد آئے
اوّلِ شب سے منتظر ہے نگاہ
صبح سے پہلے ہر کلی کھل جائے
رقص کرتی ہے مطربہ جیسے
اپنے ہاتھوں میں آفتاب اٹھائے

پھر زمیں پر یہ فیصلانِ حرم
جن کے ترکش سے آسماں تھرّائے

صبحِ فردا کے خوابِ نوشیں میں
جاگتے ہوں ابوالحسن جیسے

رقص کرتے ہیں خواب میں طاؤس
پاؤں میں باندھ کر چمن جیسے

چترِ شاہی کا عکس گلیوں میں
دشت میں آہوئے ختن جیسے

سرزمینِ عراق کے فرزند
ایک دنیا پہ خندہ زن جیسے
جنگجو بستیوں میں شہروں میں
کوہساروں میں خیمہ زن جیسے
اُڑ رہے ہیں ہواؤں میں پرچم
ناگ لہرا رہے ہوں پھن جیسے

کوہ و صحرا میں زلزلے بے چین
آسمانوں میں اہرمن بے تاب
تخت میزان سیف، ظلّ للہ
اور دریائے نیل کا سیلاب

شہزادے کی موت

یہ سماں اور رات کی جادوگری
چاند کا لے کر چلی ہاتھوں میں تاج
کچھ طلسمی لوگ پتھرائے ہوئے
کچھ طلسمی لڑکیاں جیسے تمناؤں کے مور
جن سے آ کر کھیلتی ہے رات کی نیلم پری
اور جا کر ناچتی ہے شام تک
ہر قدم پر ایک شہزادے کی موت

اک شخص دلوں میں چُبھ گیا تھا
کانٹوں کی طرح نِکل رہا ہے

چڑیوں کا چرچ

سبز پانی پر جما ہی لے کے
سارس کی طرح
پاکیزہ بن
سانپ کی صورت
درختوں پر نہ چل

سُن

سیتھہ جنگل میں شادابی کا شور

اور خاموشی

جہاں بندوق کا گہرا دھواں

اور اک طائر

شکستہ پر

لہو میں غرق

پیڑوں کے گھنے سائے میں

اب بھی نیم جاں

اس شکاری کو سزا دے
جس نے تیری اس عبادت گاہ میں
بندوق کی آواز سے
آسمان کو نیم جاں
خاموش، افسردہ بنا کر رکھ دیا

زندگی بندوق کی آواز کا اک فیصلہ
اک دھواں جو آسمان کی سمت جائے
اور نیلا آسماں
جس سے تیری اُودی
کالی اور سنہری بدلیاں آتی ہیں

برف کہساروں پہ اتنی ہے
کہ سارے جانور
مِل کے دریا میں گرا سکتے نہیں
کوئی یہ جنگل جلا سکتا نہیں

وہ دیکھو طبیبِ آخرِ شب
دیوار پہ رقص کر رہا ہے

بن مانس

بن مانس کے کالے بدن پر
ہیرے چمکتے ہیں
بن مانس کی اُجلی ہنسی سے
بچّے ڈرتے ہیں
بن مانس مجھ پر، چھلکے پھینکتا رہتا ہے

برکھا آتی ہے اور دانے بوتی ہے
جب برکھا آتی ہے اور دانے بوتی ہے
مَیں اپنے دھیان کے جنگل میں
چُھپ جاتا ہوں
بن مانس کے کالے بدن پر ہیرے چمکتے ہیں
بن مانس کی اُجلی ہنسی سے بچّے ڈرتے ہیں

شہید پرندے کا ایک خواب

پھر مٹر کا وہ دانہ چُراؤں
جو اَب بھی
ایک دہقان کے گھر میں
یہ خواب دیکھتا ہے
کہ وہ پر شکستہ
پرندے کی مانند
اُڑتے ہوئے
ایک شہزادے کی گود میں
گر گیا ہے

اُڑ چکی تھیں شاخوں سے بلبلیں بہاروں میں
ہم نے صرف شاخوں پر گل کھلے ہوئے دیکھے

طوفانی رات کی آواز

اے رونے والے بادل
چپ ہو جا
دستک دینے والے جھکڑ
باہر آ
کوئل مجھ میں کوک رہی ہے
ڈالی مجھ میں سوکھ رہی ہے
خزاں کا سورج نکل رہا ہے

میں بھی چپ ہوں
تو بھی چپ ہو جا
میں بھی سونے والا ہوں
تو بھی کسی دہقان کے گھر سو جا
اے رونے والے بادل
چُپ ہو جا

سرخ گلاب

خوابوں کی افسردہ ہوا میں
رہنے والے سرخ گلاب
جنگل کی تاریک فضا میں
لے کے نکل آتے ہیں چراغ
یعنی خواب میں سورج بن کے
جنگل میں لہراتے ہیں
وہ جو کسی غمگین شجر کے
سائے میں سو جاتے ہیں

عجیب شور ہُوا چشمۂ عنادل پر
کہ سُرخ پھول کِھلے آستینِ قاتل پر

قیس کا مکان

دیکھ لیلیٰ رہتی ہے
ہر ٹھنڈے چشمے کے قریب
اور مجنوں اپنے نخلستاں کے بیچ

دیکھ لیلیٰ اک شجر ہے
اور شجر کے سائے میں
رہتا ہے قیسِ عامری
چار دیوانوں کے بیچ
دیکھ مجنوں ناچتا ہے
ٹھنڈے چشموں کے قریب
اور اس کا سایہ
رہتا ہے تمنّاؤں کے بیچ

کاک ندی کی مٹی لال

کاگا کاک ندی کی مٹی لال
کاگا کاک ندی کے کنارے
ایک محل ہے جس میں شجر ہیں
اور شجر کے سائے میں ساجن کا گھر ہے

کا گا کاگ ندی کے کنارے
سوت کے دھاگے کچّے ہیں
چتا کے شعلے سچّے ہیں
شیر کے بچّے ہیں
کا گا چنچل بادل بیچ میں آئے
تو مت ڈرنا بادل سے
پاگل ندی بیچ میں آئے
تو مت ڈرنا پانی سے

دیکھ فضا میں
بارش کے آثار بہت ہیں
لیکن گھاٹ پہ کھیون ہار بہت ہیں
کاگا چنچل موجوں کے کارن
اب بھی اس کے بجرے ناچیں گے
ڈیرے ناچیں گے

کاگا کاک ندی کے کنارے

جھولے پڑے ہیں
گھر کے آنگن میں
شبیر کھڑے ہیں
کاگا اڑتے اڑتے ہار نہ جانا
ساجن کے گھر جانا
کاگا کاک ندی کے کنارے
کاگا کاک ندی کی مٹی لال

(شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے ماخوذ)

سورج سے آگے اک جنگل ہے

سورج سے آگے اک جنگل ہے
میں اس جنگل کا دیا ہوں
چاند سے آگے میرا گھر ہے
میں اس گھر کا دیا ہوں
سورج سے آگے اک جنگل ہے
میں اس جنگل کا دِیا ہوں

میں کیا جانوں
کس جنگل میں میرا گھر ہے
سوئی ہوئی چڑیا سے پوچھو
رات کی کتنی گھڑیاں
باقی ہیں
میں کیا جانوں
کس جنگل میں میرا گھر ہے
سورج سے آگے اک جنگل ہے
میں اس جنگل کا دِیا ہوں

آج ستارے آنگن میں ہیں اِن کو رخصت مت کرنا
شام سے میں بھی الجھن میں ہوں تم بھی غفلت مت کرنا

ہر آنگن میں دیئے جلانا، ہر آنگن میں پھول کھلانا
اس بستی میں سب کچھ کرنا ہم سے محبت مت کرنا

اجنبی ملکوں، اجنبی لوگوں میں آکر معلوم ہُوا
دیکھنا سارے ظلم وطن میں لیکن ہجرت مت کرنا

اُس کی یاد میں دن بھر رہنا، آنسو رو کے چپ سادھے
پھر بھی سب سے باتیں کرنا اس کی شکایت مت کرنا

شام عجیب شام تھی جس میں کوئی افق نہ تھا
پھول بھی کیسے پھول تھے جن کو سخن کا حق نہ تھا

یار عجیب یار تھا جس کے ہزار نام تھے
شہر عجیب شہر تھا جس میں کوئی طبق نہ تھا

ہاتھ میں سب کے جِلد تھی جس کے عجیب رنگ تھے
جس پہ عجیب نام تھے اور کوئی ورق نہ تھا

جیسے عدم سے آئے ہوں لوگ عجیب طرح کے
جن کا لہو سفید تھا جن کا کلیجہ شق نہ تھا

جن کے عجیب طور تھے جن میں کوئی کرن نہ تھی
جن کے عجیب درس تھے جن میں کوئی سبق نہ تھا

لوگ کٹے ہوئے ادھر، لوگ پڑے ہوئے اُدھر
جن کو کوئی الم نہ تھا جن کو کوئی قلق نہ تھا

جن کا جگر سِیا ہوا جن کا لہو بجُھا ہوا
جن کا رفو کیا ہوا چہرہ بہت ادق نہ تھا

کیسا طلسمی شہر تھا جس کے طفیل رات بھی
میرے لہو میں گرد تھی آئینۂ شفق نہ تھا

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

اس کے قدم سے پھول کھلے ہیں میں نے سنا ہے چار طرف
ویسے اس ویران سرا میں پھول کھلانا مشکل ہے

تنہائی میں دل کا سہارا ایک ہوا کا جھونکا تھا
وہ بھی گیا ہے سوئے بیاباں اس کا آنا مشکل ہے

شیشہ گروں کے گھر میں سُنا ہے ایک پری کل آئی تھی
ویسے خیال و خواب ہیں پریاں اِن کا آنا مشکل ہے

ستارے ہاتھ میں لے کر خطاب کرتا ہوں
میں آسمان سے اکثر خطاب کرتا ہوں

چراغِ شام جلاتا ہوں اپنی محفل میں
مگر چراغ جلا کر خطاب کرتا ہوں

میں بے بسی کی سمجھتا ہوں مصلحت ورنہ
کبھی کبھی دمِ خنجر خطاب کرتا ہوں

مہتاب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص
یہ خواب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

نیلم کی طرح رات چمکتی ہے دیکھنا
کمخواب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

نغمے میں ڈوبنے کے لئے میرا ہمنشیں
بیتاب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

وہ دیکھو فرشِ گُل ہے کہ ہمراز ہے کوئی
محراب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

اس زندگی کے بیچ بُلاتا ہوا جمیلؔ
گرداب ہے کہ ایک نیا آسمانی شخص

ویران دل میں درد کی کلیاں چٹک گئیں
یادیں بھی کہکشاں کی طرح دُور تک گئیں

کیا جانیے وہ صبحِ محبت کب آئے گی
آنکھیں بھی انتظار میں اے جان تھک گئیں

پہلے مجھے تلاش کیا اپنے شہر میں
پھر دوستوں کی آنکھیں ستاروں تلک گئیں

اپنے سب چہرے چھُپا رکھّے ہیں آئینے میں
میں نے کچھ پھول کھِلا رکھّے ہیں آئینے میں

تم بھی دنیا کو سناتے ہو کہانی جھوٹی
میں نے بھی پردے گرِا رکھّے ہیں آئینے میں

پھر نکل آئے گی سورج کی سنہری زنجیر
ایسے موسم بھی اٹھا رکھّے ہیں آئینے میں

میں نے کچھ لوگوں کی تصویر اتاری ہے جمیلؔ
اور کچھ لوگ چھُپا رکھّے ہیں آئینے میں

ایک سبو بدوش غم ایک بہار نیم جاں
جس نے بنا دیا ہمیں اپنے جنوں کا حکمراں

ہم ہیں شناوروں کا ادج اپنے مسافروں کی فوج
ہم نے جلائیں موج موج اپنی خودی کی کشتیاں

غم کی سپاہ صف بہ صف لے کے جمیل ہر طرف
آؤ بجائیں اپنا دف ہم ہیں امیرِ کارواں

شیخ کے گھر کے سامنے آبِ حرام ڈال دوں
جام و سبو کی آگ میں اپنا کلام ڈال دوں

شہر کے اس ہجوم میں جینے کا حوصلہ رکھوں
اپنے جنوں کی آگ میں شہر کی شام ڈال دوں

صبح سے کچھ عجیب غم دشت میں ہیں ہمارے ساتھ
ان کے سروں پہ میں ذرا چادرِ شام ڈال دوں

بسترِ مرگ پر مجھے جینے کے خواب دے گئے
جاؤں انھی کے سامنے ان کا کلام ڈال دوں

آج شبِ وصال ہے دیکھیں گے آپ ہجر بھی
آگ جلا کے عشق کی اس میں دوام ڈال دوں

غمِ جاناں کی خبر لاتی ہے
کوئی آواز اگر آتی ہے

جانے کس سمت ہوا کی زنجیر
کھینچ کر مجھ کو لئے جاتی ہے

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

ناگہاں آئی تھی ہم پر بھی جمیل
وہ قیامت جو گزر جاتی ہے

میں جنھیں فریب سمجھوں تیری یادِ مہرباں کے
وہ چراغ بجھ گئے ہیں میری عمرِ جاوداں کے

نہ یہ لالہ زار اپنے نہ یہ رہِ گزار اپنی
وہی گھر زمیں کے نیچے وہی خواب آسماں کے

یہ پیالہ ہے کہ دل ہے یہ شراب ہے کہ جاں ہے
یہ درخت ہیں کہ سائے کسی دستِ مہرباں کے

مجھے یاد آ رہے ہیں وہ چراغ جن کے سائے
کبھی دوستوں کے چہرے کبھی داغ رفتگاں کے

قاتل کا ہاتھ ہے نفسِ آتشیں شناس
لیکن ہمارا عشق بھی ہے آستیں شناس

ہاں آبِ جو میں آج فقط گرد رہ گئی
دیکھو کہاں گئے وہ گُل و یاسمیں شناس

اب اپنے دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں
ہم لوگ جو کبھی تھے فقط نازنیں شناس

میرے خدا نے بہت صبر کیا میرے ساتھ
ورنہ کہو سانحہ کیا نہ ہوا میرے ساتھ

بادِ صبا لے چلی ایک نئے شہر میں
اور مرا قافلہ چل نہ سکا میرے ساتھ

ایک بگولہ کہ ہے جس میں بہت پیچ و تاب
عمرِ رواں کی طرح آج بھی تھا میرے ساتھ

عمرِ رواں لے گئی میرا سکوں چھین کر
اور میرے صبر کو چھوڑ دیا میرے ساتھ

مجھ سے مری زندگی آپ الجھتی رہی
ورنہ کوئی مرحلہ اور نہ تھا میرے ساتھ

ایک عجب زندگی مجھ پہ گزرتی رہی
پھر یہ عجب سلسلہ بھی نہ رہا میرے ساتھ

وہ چاند ہے نہ صبا ہے عجیب آدمی ہے
جو فصلِ گل ہیں ملا ہے عجیب آدمی ہے

وہ یوں تو ہم سے ملاقات کرنے آیا تھا
مگر ہمی سے خفا ہے عجیب آدمی ہے

ہماری آنکھ میں اک برگِ سبز سے کم تھا
جو شاخِ گل پہ کھلا ہے عجیب آدمی ہے

یہ آدمی مجھے اس موسمِ بہاراں میں
اسی کھنڈر میں ملا ہے عجیب آدمی ہے

شبِ مہتاب کے اسیروں سے
رات گلزار ہے فقیروں سے

چاند جیسے نکلنے والا ہے
آپ کے ہاتھ کی لکیروں سے

روز کہتا ہے آ کے قصّۂ ہجر
دلِ بے تاب ہم صفیروں سے

شہر آباد ہو رہے ہیں جمیلؔ
پھر محبت کے راہگیروں سے

کس سفر میں ہیں کہ اب تک راستے نادیدہ ہیں
آسماں پر شمعیں روشن ہیں مگر خوابیدہ ہیں

یہ گلستاں ہے کہ اُڑتی ہے تمنّاؤں کی خاک
یہ ہَوا ہے یا بیاباں کے قدم لرزیدہ ہیں

آج گھر کے آئینے میں صبح سے اک شخص ہے
اور کھڑکی میں ستارے شام سے پیچیدہ ہیں

رہگُزر کہتی ہے جاگ اے ماہتابِ شامِ یار
ہم سرِ بازار چلتے ہیں مگر خوابیدہ ہیں

ایک سماں دشت و بیاباں میں ہے
میری طرح عالمِ ہجراں میں ہے

میں ہی نہیں اپنی فغاں کا سبب
تو بھی مرے سینۂ سوزاں میں ہے

اُس نے کہا میرے لئے کچھ سکوں
اب بھی تری زلفِ پریشاں میں ہے

اُس نے کہا تیرے جنوں کے لئے
کام بہت شہر و بیاباں میں ہے

بہار آئی تو قول و قسم کے پھول کھِلے
وفا کا ذکر چلا اور ستم کے پھول کھِلے

کسی کی آنکھ میں کاجل کہ جامِ جم میں ہے رات
کہ دشتِ جاں سے الگ چشمِ نم کے پھول کھِلے

لپٹ کے سوگئی ویران بستیوں میں بہار
ہزار شہر میں دام و درم کے پھول کھلے

عجیب سادہ و بے کیف تھا وہ قصۂ شوق
مگر بیان میں آیا تو غم کے پھول کھلے

یہ کیا تضاد ہے اس کائنات میں اے دوست
کہ ہر وجود کے اندر عدم کے پھول کھلے

جمیلؔ پہلے کہاں تھے دعا کے دروازے
یہ تیرے ہاتھوں میں کیسے حرم کے پھول کھلے

ڈھولک سی ہَوا بجا رہی ہے
کیا فصلِ بہار آ رہی ہے

آنچل میں چراغ جل رہے ہیں
بادل کی قطار جا رہی ہے

سورج میں لہک رہا ہے کوئی
سنگم کو دھنک سجا رہی ہے

جنگل کی ہَوا میں ایک چڑیا
شاخوں پہ دیئے جلا رہی ہے

شہر والے شاہراہوں پر فغاں بھی کر چکے
آگ سڑکوں پر لگا آئے دھواں بھی کر چکے

ہم یہاں تک ایک دریا سے اُتر کر آئے تھے
اب لہو سے سرخ اپنا آسماں بھی کر چکے

جانے کیسے لوگ تھے جن کا پتہ ملتا نہیں
ہم محبت میں شمارِ کشتگاں بھی کر چکے

شہر میں سب کی غیبتیں مجلسوں میں نواگری
پھر بھی مرے لہو میں ہے ایک عجب قلندری

چاند میں جیسے فاختہ شاخ پہ جیسے چشمِ نم
غم ہے عجیب کھو کھلا رات عجیب مسخری

رات بہشت میں مجھے اپنا خدا بھی مل گیا
میں نے اسی کو سونپ دی اپنی کلاہِ کمتری

اُس کی گلی سے آئے ہیں لوگ یہ سوچتے ہوئے
آنکھ میں ہفت آسماں ہاتھ میں اک کبوتری

گلیوں میں اسی طرح سے تنہا نظر آئے
یہ راہ گزاروں پہ تری یاد کے سائے

آساں نہیں موسم کے گریباں سے الجھنا
لیکن یہ تماشے بھی ہواؤں نے دکھائے

یہ شہر یہ سیلاب یہ گرتی ہوئی دیوار
اس شہر میں ہم لوگ کہاں سے نکل آئے

میں سوچ رہا ہوں کہ تری یاد سے پوچھوں
یہ پھول یہ شاخوں پہ دیئے کس نے جلائے

چاند شاخوں میں گرفتار آیا
آج پھر یاد وہ دلدار آیا

پھر وہی وصل کی ساعت آئی
پھر وہی ہجر کا بازار آیا

شہر میں آج محبت کا چراغ
لے کے یہ کون طرحدار آیا

رات کی شمعیں بجھا دو کہ جمیلؔ
صبح کا یارِ وفادار آیا

آج مجھے جینے کا خیال نہیں ہے
عشق تو ہے روح میں جلال نہیں ہے

آج سمندر میں تھا عجیب تلاطم
لوگ سمجھتے رہے دھمال نہیں ہے

رات مرے سامنے بہار نہیں تھی
آج مری روح میں ملال نہیں ہے

جاؤ صبا سے کہو چراغ جلائے
آج مرے ساتھ وہ غزال نہیں ہے

یہ گلاب آسماں سے آئے ہیں
یا کسی لامکاں سے آئے ہیں

ہم اندھیروں میں رہنے والوں تک
یہ اُجالے کہاں سے آئے ہیں

یہ ستارے ہماری آنکھوں میں
اپنی طرزِ بیاں سے آئے ہیں

ہم ابھی آئے ہیں وہیں سے جمیل
یہ ستارے جہاں سے آئے ہیں

سایہ نہیں ہے دُور تک سائے میں آئیں کس طرح
ہم آ گئے ہیں کس طرف تم کو بتائیں کس طرح

عالمِ بہاراں کا سہی منظر گلستاں کا سہی
بستی بیاباں کی سہی دامن بچائیں کس طرح

جس پھول کی ہر پنکھڑی ہوتی ہے موتی کی لڑی
اُس پھول کی خاطر کبھی آنسو بہائیں کس طرح

فضا میں شعلے تھے ایسے چنگھاڑ ایسی تھی
جو رات آئی تھی ہم پر پہاڑ ایسی تھی

مسافروں کو نظر آ رہی تھی ہجر کی رات
کہ زلزلوں سے زمیں پر دراڑ ایسی تھی

کبھی کُھلا تو کبھی بند ہو گیا اے دوست
کہ اس مکان کی قسمت کواڑ ایسی تھی

ہمیں یقین تھا آخر ملاپ ہو گا جمیلؔ
کہ درمیان میں دونوں کے آڑ ایسی تھی

چلے آئے بات کرنے وہ سیاستِ جہاں پر
کہ سمندروں میں جیسے کوئی پھینکتا ہو پتھر

مگر اپنی زندگی ہے وہی اک قبائے ماتم
جو عجیب لگ رہی ہو کسی عمرِ رائگاں پر

ترے دِل کے سائباں میں گرائیں عجب اچانک
کوئی سگ گزیدہ جیسے گرے اپنے گھر میں آکر

کیسی یہ قیامت ہے آسمان سے آگے
لامکان رہتا ہے ہر مکان سے آگے

اپنے گھر کے آنگن میں جب بہار آتی ہے
لڑکیاں نکلتی ہیں سائبان سے آگے

آکے میری کھڑکی میں لامکاں ٹھہرتا ہے
عشق رقص کرتا ہے ہر گمان سے آگے

آج ویرانے میں کچھ پھول کھلاتے ہم بھی
اپنے دل میں تیری یادوں کو جگاتے ہم بھی

اُس کے کاکل میں کوئی افعی دکھاتے ہم بھی
جا کے مہتاب کو شاخوں میں ڈراتے ہم بھی

کیسی ویران سی رہتی ہے تمناؤں کی رات
کاش اس رات کوئی خواب سناتے ہم بھی

آگ جو دل میں محبت نے لگائی ہے جمیلؔ
جی میں آتا ہے کہ دامن سے بجھاتے ہم بھی

اپنا ادب اور اپنا کلام
کیا جانیں بے چارے عوام

جیسے کسی نے چھین لیا ہے
میری زباں سے میرا کلام

میرا عمل ہے میری کتاب
میری غزل ہے میرا پیام

جاگ رہے ہیں خواب میں بھی
نیند میں بھی ہے نیند حرام

وشتِ بے آب میں ہوں روز چراغاں ایسے
لوگ ہر سمت نظر آئیں غزالاں ایسے

دیکھو اس جشن میں ہم نے بھی سُنائے اشعار
شعر کچھ تم بھی سناؤ لبِ جاناں ایسے

زندگی ساری محبت میں گزاری لیکن
آخری وقت میں تم ہو گئے ناداں ایسے

گھاس پر بیٹھے ہوئے کہتے ہیں کچھ لوگ جمیل
دیکھو سی لیتے ہیں بیٹھے ہوئے داماں ایسے

ہم کہ آرائشِ فن جانتے ہیں
درد کو دینِ سخن جانتے ہیں

ایک پردہ ہے بیاباں کے قریب
جس کو دیوارِ چمن جانتے ہیں

یہ ستاروں میں بھٹکتی ہوئی رات
ہم اسے اپنی تھکن جانتے ہیں

جس جگہ بیٹھ کے روتی ہے بہار
ہم اسے کنجِ چمن جانتے ہیں

چاندنی جن کو جگاتی ہے جمیلؔ
وہی کانٹوں کی چبھن جانتے ہیں

میں اس چراغ کا شعلہ بجھائے دیتا ہوں
غزل کہی ہے تمھیں بھی سنائے دیتا ہوں

وہ دیکھو صبح انھی کھڑکیوں سے آتی ہے
میں اس لئے یہ ستارے بجھائے دیتا ہوں

چراغِ شام ہَوا ہے بہت خنک لیکن
میں اپنے سائے میں سورج چُھپائے دیتا ہوں

پہاڑیوں پہ سناتا ہوں پھر کلامِ شریف
کہ ماہتاب ہے مژگانِ یار کی تصنیف

بہار بن کے نکلتا ہے ایک تازہ خیال
تو اس بہار میں آتی ہے ایک تازہ ردیف

طلسمِ شوق سے جلتا ہے غم کدے کا چراغ
پرندہ بن کے چہکتا ہے اک مردِ ضعیف

مگر یہ حُسن کے محبت بھی رو پڑے شاید
کہ پھر زمیں پہ ستارے گرا رہی ہے خریف

دشمن کے گھر کے سامنے کچھ لالہ زار تھے
جن میں ہوس کے پیڑ تھے اور گہرے غار تھے

نالے تھے بلبلوں کے مگر وحشتیں نہ تھیں
نغمے تھے مطربوں کے مگر بے وقار تھے

دل بے قرار، گریۂ خونیں کی طرح شام
اور ہر زمیں کے قطعے پہ کچھ چوبدار تھے

اُگتے تھے جیسے خنجرِ خونیں کے ساتھ گُل
ہر آستیں میں سانپ شریکِ بہار تھے

ایک پتّھر کہ دستِ یار میں ہے
پھول بننے کے انتظار میں ہے

اپنی ناکامیوں پہ آخرِ کار
مسکرانا تو اختیار میں ہے

ہم ستاروں کی طرح ڈوب گئے
دن قیامت کے انتظار میں ہے

اپنی تصویر کھینچتا ہُوں میں
اور آئینہ انتظار میں ہے

کچھ ستارے ہیں اور ہم ہیں جمیلؔ
روشنی جن سے رہگزار میں ہے

خانۂ حیرت تماشا لے چلا
یہ نہنگ تشنہ دریا لے چلا

کیسا عالم ہے کہ بلبل کی صدا
میرے گھر کا ایک شعلہ لے چلا

صحرا میں کھلے گلاب جیسے
یہ لوگ ہیں کیسے خواب جیسے

میرے ہی لہو میں سرد ہو گا
ہر شام یہ آفتاب جیسے

ہر رات کسی کی یاد آئی
وہ یاد بھی کیسی خواب جیسے

جاں بادۂ خوش مزاج اتنی
ہمسایۂ ماہتاب جیسے

یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے

کچھ دیر جمیلؔ ہم بھی ٹھہرے
دیوار پہ آفتاب جیسے

میں جہاں ہوں ایک دریا صبر سے لبریز ہے
اور اس دریا کے آگے ہجر آفت خیز ہے

اُس نے چپکے سے کہا اے جانِ من آہستہ بول
میرے گھر میں ایک لڑکا اور آفت خیز ہے

صبح کا مزدور، دن کا آسماں شب کا گداز
اور چاروں سمت اک بستی الم انگیز ہے

شہر ہے ویرانیاں ہیں اور سمندر کے قریب
ایسا لگتا ہے ہماری گفتگو کی میز ہے

تمھارے نام سے میرا کوئی حوالہ نہ تھا
کہ میرے نام کا جرعہ تہہِ پیالہ نہ تھا

اس آسمان سے اترے ہوئے صحیفے میں
مِرا کلام تھا نقّاد کا نوالہ نہ تھا

جمیلؔ میرا ہی شعلہ تھا میرے غم کا حریف
مسائلِ ادب و دفترِ رسالہ نہ تھا

ستارے آسمانوں میں صدا کے ساتھ ناچیں گے
زمیں پر آدمی سارے ہوا کے ساتھ ناچیں گے

خداوندا قیامت ہیں سنا ہے میرے بچّے بھی
کسی استاد کے پیچھے ادا کے ساتھ ناچیں گے

محبت جس کو کہتے ہیں وہ انگارے ہیں پھولوں کے
جو شاخوں سے اگر ٹوٹے صبا کے ساتھ ناچیں گے

ہمیں شاعر کہو صاحب کہ ہم جلسے میں یاروں کے
سنا کر شعر کچھ اپنے ہوا کے ساتھ ناچیں گے

جمیلؔ اپنی محبت ہیں نہ جانے ہم کہاں جاتے
مگر اب تو بہاروں میں ہوا کے ساتھ ناچیں گے

داغ روشن ہیں چمن میں جا کے موروں سے کہو
سرخ ہیں پھر مہوشوں کے دل چکوروں سے کہو

پھر گلابوں سے کہو نکلیں سرِ شہرِ وفا
جامِ مے چھلکائیں نرگس کے کٹوروں سے کہو

مہر و مہ تک گھومتے ہیں آدمی کے سامنے
تم تو شہزادے ہو مٹّی کے سکوروں سے کہو

ہر ہاتھ میں کمان ہے اس کا خیال کر
یہ شہر بے امان ہے اس کا خیال کر

بوڑھوں کی طرح بات نہ کر ہم سے جانِ من
یہ دل ابھی جوان ہے اس کا خیال کر

یہ شاعری ہماری غریبوں کا گھر نہیں
جبریل کا مکان ہے اس کا خیال کر

پہلے لہو میں ایک عجب روشنی سی تھی
اب ایک بدگمان ہے اس کا خیال کر

ایک عجب شہزادہ میرے باغوں کا
دیکھو آیا موسم سرخ چراغوں کا

ناچ رہی ہے ایک شجر پر ساری بہار
اور یہاں بھی شور بہت ہے زاغوں کا

دل کے باہر جھگڑا دیکھنے والوں میں
دل کے اندر میلہ ایک چراغوں کا

دیکھو اب بھی میرے محل میں رہتا ہے
ایک عجب ویرانہ میرے داغوں کا

رکھو گے کیسے دل میں ستارہ سنبھال کر
آؤ کوئی چراغ جلاؤ نکال کر

کیوں سن رہے ہیں لوگ بہاروں کی گفتگو
یہ میرے گھر کی شام سے آ کر سوال کر

مَیں نے جمیلؔ دیکھی ہے سورج مُکھی کی آنکھ
جو لے گیا ہے شہر کا راجہ نکال کر

بارش کے ساتھ آنے لگا پھر عجب سُرور
شاخوں پہ دیکھو رونے لگا پھر دلِ صبور

میں بات کر رہا تھا ابھی آسمان سے
اُڑنے لگے ہوائے بیاباں میں کچھ طیور

وہ کشتِ جاں میں ایک محبت کا سرخ پھول
جس کو بہارِ شوق میں کہتے ہیں کوہِ طور

اس سے کلام کر کے عجب روشنی ملی
ہم جیسے آدمی کے لئے غیب کیا ضرور

اک دن جمیلؔ نکلے گا ہر گھر سے ماہتاب
ہاتھوں میں لے کے میری محبت کا کوہِ نور

آسماں پر اک ستارہ شام سے بیتاب ہے
میری آنکھوں میں تمھارا غم نہیں ہے خواب ہے

رات دریا آئینے میں اس طرح آیا کہ میں
یہ سمجھ کر سو گیا دریا نہیں اک خواب ہے

کامنی صورت میں بھی اک آرزو ہے محوِ خواب
سانولی رنگت میں بھی اک وصل کا کمخواب ہے

میری خاطر کچھ سنہری سانولی مٹی بھی تھی
ورنہ اس کا جسم سارا روشنی کا خواب ہے

آسماں اک بسترِ سنجاب لگتا ہے مجھے
اور یہ قوسِ قزح جیسے کوئی محراب ہے

کِس کے استقبال کو اٹھّے تھے دیوانوں کے ہاتھ
کِس کے ماتم کو یہاں یہ مجمعِ احباب ہے

یا الٰہ آباد میں رہیئے جہاں سنگم بھی ہو
یا بنارس میں جہاں ہر گھاٹ پر سیلاب ہے

اس نہنگِ تشنہ سے زور آزما ہو کر جمیلؔ
بھول مت جانا کہ آگے بھی وہی گرداب ہے

زندگی کا شور تھا بندوق کا غُل تو نہ تھا
عشق سے پہلے ہمارا شہر کابل تو نہ تھا

تم بہت ناداں ہو فصلِ گُل سمجھتے ہو جسے
رات وہ میرا لہو تھا شورِ بلبل تو نہ تھا

میرے سازِ دل سے نغمہ اس طرح پھوٹا کہ میں
سوچتا ہی رہ گیا میرا تخیّل تو نہ تھا

جزو کی صورت اُڑے جاتے ہیں لڑکے جس طرف
اس طرف بازیچۂ اطفال تھا کُل تو نہ تھا

ایک سیلابِ بہاراں ہے کہ جاتا ہے وہاں
دیکھنا پہلے جہاں لکڑی کا اک پُل تو نہ تھا

ہزار بار آئینے گرے ہیں میرے رُو برو
یہ بجلیاں سی ہر طرف یہ روشنی سی چار سُو

میں دیوتاؤں سے کبھی مِلا نہیں ہوں آج تک
اگر یہ دیوتا نہیں قلندرانِ بے سُبُو

ہمارا دل دُکھوں سے چُور ہے عجب زبور ہے
اُس آدمی کا نور ہے جو مر رہا ہے کُو بہ کُو

جی میں آتا ہے تو غم کا ہر صنوبر بیچ دو
اپنے غم خانے میں جا کر ہفت کشور بیچ دو

بادبانوں سے کہو اس کی رفاقت کے لئے
ہم نے اپنے شہر بیچے تم سمندر بیچ دو

ہم تمھاری ہر ادا کے ناز برداروں میں ہیں
جی میں آتا ہے تو ہم کو بھی اٹھا کر بیچ دو

آئینہ رکھ لو کہ اس میں مَیں نظر آؤں گا پھر
اور اپنی یہ دکانِ لعل و گوہر بیچ دو

گُل نے آواز دی شبنم کے سوا میں بھی ہوں
ابر کی اوٹ سے تارے نے کہا میں بھی ہوں

ایک مینار سے افسردہ شجر کا مہتاب
مجھ سے کہتا ہے کہ صحرا سے چلا میں بھی ہوں

مجھ سے کہتی ہے محبت کہ ترے گھر کے قریب
اس بیابان میں اے خلقِ خدا میں بھی ہوں

دینارِ شہنشاہ سے کہتا ہے گداگر
دنیا ہی کی پاپوش میں رہتا ہے گداگر

دل جیسے سلاطین کا سایہ ہے مگر غم
جب عشق میں ہوتا ہے تو سہتا ہے گداگر

یہ حوصلۂ دردِ گدائی بھی تو دیکھو
دریا ہے ہر اک کوچے میں بہتا ہے گداگر

ماتم ہے مگر کوئی سیہ پوش نہیں ہے
محفل میں ہر اک شخص سے کہتا ہے گداگر

اس بستی میں اک بچّہ بھی مفلس نہ رہے گا
آواز لگاتا ہے تو کہتا ہے گداگر

پھول عجیب رنگ کے صبح نے کل کھلا دیئے
تم سے نہ مل سکے مگر دشت و جبل کھلا دیئے

میں نے خدا کے شہر میں جا کے خدا خدا کیا
اور خدا نے کُو بہ کُو لات و ہبل کھلا دیئے

ایک عجب زندگی مجھ پر گزر گئی جمیلؔ
ایک عجیب یار نے مجھ کو یہ پھل کھلا دیئے

دوستوں کو ذرا اپنا غم میری جاں تم دکھاتے نہیں
گیت گاتے نہیں رقص کرتے نہیں مسکراتے نہیں

صحنِ جاں کو بناتے ہو تم آج شب اپنی بزمِ طرب
تو کبھی یہ بھی سوچا ستاروں سے آنکھیں چُراتے نہیں

اپنی محفل میں سب کو بُلاتے بھی ہو پھر اٹھاتے بھی ہو
یہ بتاؤ ہمیں کیوں بُلاتے نہیں پھر اُٹھاتے نہیں

اپنی پلکوں سے گر جائے تو کیا کہیں اور کس سے کہیں
یہ گُہر اپنی پلکوں سے ہم اس طرح تو گراتے نہیں

دیکھو پلکوں پہ کیسے گُھر آئے ہیں ہم سفر آئے ہیں
ہم سفر اپنا غم تو کبھی ہم سفر سے چُھپاتے نہیں

وہ سمجھتے ہیں دل میری معراج ہے میرا سرتاج ہے
وہ سمجھتے نہیں دل کو اتنا بھی سر پر چڑھاتے نہیں

ہاں اسی شہر کا اک ماہِ مبیں تھا وہ گلاب
پھر بھی اس دل کے سوا کچھ بھی نہیں تھا وہ گلاب

جانے کیوں خواب کے مانند نظر آتی ہے شام
جانے کیوں اب بھی فسردہ سا کہیں تھا وہ گلاب

جو کبھی شہر کی آنکھوں سے چھپی رہتی تھی
ہاں اسی مجلسِ مژگاں کا امیں تھا وہ گلاب

جو کبھی جانِ چراغاں تھا سرِ خانۂ یار
آج اس خانۂ جاں میں بھی نہیں تھا وہ گلاب

دیکھو وہ آبِ جو میں پھر چاند کا ایک عکس ہے
میری ہی جستجو میں پھر چاند کا ایک عکس ہے

میرے ہی دل میں روشنی پیڑ سے چھن کے آئی تھی
میری ہی گفتگو میں پھر چاند کا ایک عکس ہے

دل کے ہر ایک زخم میں ایک بہار ہے جمیلؔ
آج رگِ گلو میں پھر چاند کا ایک عکس ہے

ہم نے خود اپنے دھیان میں دیکھا غار کے اوپر چاند ہے
یعنی ہر اک نادان میں دیکھا غار کے اوپر چاند ہے

کالا افق ہے کالا سمندر کالی چٹانیں ہر طرف
یعنی ہر اک بے جان میں دیکھا غار کے اوپر چاند ہے

کالے صنوبر کالے کبوتر کالی محبت رات کی
یعنی ہر اک دیوان میں دیکھا غار کے اوپر چاند ہے

آسمانوں میں سنہری جھاڑیاں
لال مٹی میں یہ گھوڑا گاڑیاں

شہر کے باغوں میں وہ پیپل کے پیڑ
اور برگد کی یہ لانبی داڑھیاں

لڑکیوں کے ساتھ آجاتے ہیں سانپ
شہر میں جب شام ہو اور جھاڑیاں

چاند ہے یا رات کے ایوان میں قندیل ہے
یا مِرے ویران دل کی سیمگوں تمثیل ہے

میں نہیں ہوں ایک جنگل ہے جہاں سب سے الگ
ایک شہزادے کلہ گھر ہے اور غم کی جھیل ہے

میرے گھر میں ایک لڑکا مجھ سے کرتا ہے کلام
جس سے لگتا ہے کہ ہر دِن ایک سنگِ میل ہے

شہر میں کچھ لوگ ایسے بھی قیامت خیز ہیں
جن کے آگے ہیچ دجلہ اور آبِ نیل ہے

شہر کی گلیاں گھوم رہی ہیں میرے قدم کے ساتھ
ایسے سفر میں اتنی تھکن ہیں کیسے کٹے گی رات

خواب میں جیسے گھر سے نکل کر گھوم رہا ہو کوئی
رات میں اکثر یوں بھی پھری ہے تیرے لیے اک ذات

چند بگولے خشک زمین پر اور ہوائیں تیز
اس صحرا میں کیسی بہاریں کیسی بھری برسات

شور مچائیں بستی بستی سوچ رہے تھے آپ
دیکھا کن کن ویرانوں میں لے کے گئے حالات

○

آنکھوں میں اگر آج وہ مہتاب نہ ہوتا
میں اپنے لیے صبح تلک خواب نہ ہوتا

کمرے میں اگر کھڑکی سے کچھ پھول نہ گرتے
دل تیرے لئے اس طرح بے تاب نہ ہوتا

بستی میں کبھی عشق کی آواز نہ آتی
دریا میں اگر نغمۂ سیلاب نہ ہوتا

شبِ فراق ہوا میں دیئے جلانے کا
ہمارے نام سے آغاز کر گئے کچھ لوگ

○

دِیا جلا کے نہ گھبراؤ روشنی کے لئے
یہ دو ستارے بھی لے جاؤ روشنی کے لئے

○

چھتریاں لے کے سرِ شام نکلنے والے
جانتے ہیں کہ یہ موسم ہیں بدلنے والے

ناخدا کشتی کا تختہ لے گیا
یا مگر مچھ سارا دریا لے گیا

کیا سیاست ہے کہ بلبل کی صدا
اس کے گھر کا ایک بچّہ لے گیا

ایک جادوگر بُلایا تھا جمیلؔ
جب گیا وہ کھیل سارا لے گیا

جگمگائیں گے محبت کے یہ آئینے جمیلؔ
تم ذرا سامنے اک شمع جلا کر دیکھو

○

پھر شاخِ گُل سے نکلے گی افعی گزیدہ رات
میں طائرِ بہار نہیں ہوں کہ آؤں گا

○

دیکھو ایک شخص تو مایوس ہُوا
اپنا ہمسایہ تو محسوس ہُوا

ہزار قافلے دل میں اُتر چکے پھر بھی
یہ مصر یوسفِ کنعاں کے انتظار میں ہے

○

ڈالیاں جُھک گئیں شام کے بوجھ سے
رات زنجیر پھولوں کو پہنا گئی

○

ایک عجیب زندگی مجھ پہ گزر گئی جمیلؔ
ایک عجیب یار نے مجھ کو یہ پھل کھِلا دیئے

دل محبت میں پھر بھٹکتے ہیں
یہ ثمر آندھیوں میں پکتے ہیں

○

آج دریا میں گریں گے کچھ لوگ
ایک بجھتے ہوئے تارے کے لئے

انھی خوباں کی ہتھیلی پہ رہو
اس لئے تم کو حنا کہتے ہیں

○

وہ دیکھو ایک دیدۂ یعقوب کا چراغ
کھڑکی میں جل رہا ہے کہ شب ناتمام ہے

ہاں یوں تو نکل آتے ہیں میری طرح کچھ پھول
شاخوں سے مگر ان کی سیاست نہیں جاتی
طاؤس کے مانند نظر آتی ہے دنیا
پھر بھی مرے ویرانے کی رنگت نہیں جاتی

تین مصرعے

رات عجیب روشنی مجھ کو رُلانے آئی تھی
میں نے کہا کہ میری جاں صبح نہیں ہوئی ابھی
اس نے کہا کہ میں ذرا تم کو جگانے آئی تھی

موت سے پہلے جانور
بھاگتے ہیں شکاری سے
گرتے ہیں جا کے جال پر

آنسو سے دیئے جلا رہا ہوں
میں تیز ہوا سے بات کرنے
پھر ایک پہاڑ پہ جا رہا ہوں

بجھا کرے گا جلا کرے گا
یہ زندگی کا چراغ یونہی
جلا کرے گا بجھا کرے گا

زمیں پہ دیکھو عجب نظارہ
ہوا سے مٹی جو اُڑ رہی ہے
پرندہ بن جائے گی دوبارہ

میرے لہو کی لہر ہے
جیسے یہ کائنات بھی
خواب کا ایک شہر ہے

ہاں اس سیلاب کے اندر
تم اپنے کچھ خواب سُنانے
جاتے ہو گرداب کے اندر

خوشبو جیسے لحد سے آئے
مجھ سے ملنے آج کی شب
دیکھو لوگ ابد سے آئے

جاؤ گے تم کہاں جمیلؔ
اس کے لہو میں ڈوب کر
نکلے ہیں سارے سنگِ میل

قمقمے جل رہے ہیں پیپل میں
ایک پاگل بجا رہا ہے ڈھول
ایک سنسان سوکھے جنگل میں

نثری نظمیں

میں نے خلا میں کل رات
خدا کو اپنی موت
اور خوبصورت پھولوں سے
باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے

جنگلی لڑکیوں کے نام

غیر انسانی رات
انسانوں پر آ رہی ہے
زخمی پتّے رو رہے ہیں
نیگرو گھاس پر پھل کھا رہے ہیں
پہاڑوں، دریاؤں اور درختوں میں
کون چھُپا ہوا ہے
اے جنگلی لڑکیو
رات کا پیلا سورج
کہاں ہے
دیکھو کل رات سے سورج
مجھ میں جل رہا ہے

دریاؤں کے ٹھنڈے پانی میں
آگ لگنے والی ہے
سُرخ رنگ کی ہوائیں
مجھے کھینچ رہی ہیں
اے جنگلی لڑکیو
بستر کے شکاریوں سے ہوشیار رہنا
خدا کرے تمھاری جوتیاں
غرور کی مٹّی سے ہمیشہ بھری رہیں
جسم کی سچّائیاں بھی
آخر اک چیز ہیں
اے جنگلی لڑکیو
تمھارا حُسن
جنگل کی کالی افواہوں سے زیادہ
کچھ نہیں

دیکھو ناریل کا درخت
تمھارے آگے جُھکا ہوا ہے
میں اپنے دل کی مٹی میں
ایسا پھول اگانا چاہتا ہوں
جس میں ہر سال تم اگتی رہو
غیرِ انسانی سائکلون
انسانی آسمانوں کا تعاقب کر رہے ہیں
اے جنگلی لڑکیو
جاؤ شہر سے واپس چلی جاؤ
جنگل کا سورج
تمھارے کپڑوں سے
باہر نکلنا چاہتا ہے

کپاس کا پھول

تم مجھے قتل نہ کرو
میں خود کئی ٹکڑوں میں بٹ جاؤں گا
میرا ایک ٹکڑا
کپاس کا پھول بن جائے گا
اور دوسرا وہ آگ
جو کپاس کے پھول سے روشن ہوتی ہے
تم مجھے قتل نہ کرو
میں خود کئی ٹکڑوں میں
بٹ جاؤں گا
میرا ایک ٹکڑا

دریا بن جائے گا اور دوسرا
وہ چاند جو اس دریا میں ڈوب جاتا ہے
ہاں مجھے قتل نہ کرو
کیونکہ میں اپنی شہادت کی
گواہی دینے کے لئے دوبارہ
پیدا ہو جاؤں گا
کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورج
دوبارہ نکل آتا ہے
چاند دوبارہ طلوع ہو جاتا ہے
اور کپاس کا پھول دوبارہ کھل جاتا ہے
اور عبادت گاہوں میں آگ
دوبارہ روشن ہو جاتی ہے

درویش

میں ایک بوڑھے برگد کا درخت ہوں
جس کی شاخیں کٹ چکی ہیں اور پتّے
بکھر چکے ہیں میرے سینے میں ایک خلا ہے
جس میں ایک دن ایک بوڑھے بندر نے
پناہ لی تھی

نہیں اے بوڑھے برگد
تم اس گنبد والی عمارت سے
بہتر ہو جس میں ایک ظالم بادشاہ کی قبر ہے
نہیں تم نہیں جانتے اس گنبد کے پیچھے
جھونپڑیوں میں کچھ دیئے جل رہے تھے
جن ہواؤں نے یہ دیئے بجھائے ہیں
میں اُن ہواؤں سے اب بھی
لڑ رہا ہوں

خانہ بدوش

اگر تم ان چناروں سے کہو گے
کہ تم نے اپنے جسموں کو
چھپا رکھا تھا سانپوں کی طرح
اور تمھاری محبتیں بہہ گئیں پانی کی طرح
تو یہ جنگلی پھول
تمھیں سایہ دیں گے
تمھیں ان بستیوں میں
لے جائیں گے

جہاں درختوں کے سائے
پانی میں تمھارا انتظار کرتے ہیں

جہاں مرد
خوبصورت عورتوں سے
جشن مناتے ہیں
اور جہاں عورتیں
جانوروں پر بیٹھ کر
گیت گاتی ہیں
چاند ہماری محبّت ہے
اور سورج ہمارا غصّہ !

میں بلندیوں پر جل رہا ہوں

میں اپنے گھر میں دیئے کی طرح
جلنا چاہتا تھا
مگر اب ایک فلیٹ میں
بلب کی صورت جل رہا ہوں
اگر کوئی مجھے بجھانا چاہتا ہے
تو میرے بچّے پھر مجھے جلا دیتے ہیں

ایلسی نور کی ایک رات

کل رات جب یہ ستارہ
اسی جگہ تھا
اور آدھی رات کے گھنٹے
بج رہے تھے
مُرغ بول رہا تھا
ایسے ہی وقت میں
دمدار ستارے نکل آتے ہیں
اور چاند سمندر میں ڈوب جاتا ہے
جس موسم میں
یورپ پیدا ہوا تھا

سُنتے ہیں
مُرغ ساری رات
نغمہ ریز رہا
ایشیا ابریشموں کی طرح
خمیدہ ہے
لیکن نہ گھبراؤ
اس کے ملازم جہاز کے لنگر کی
حفاظت کر رہے ہیں
ایشیاء کے بادبانوں میں
ہوائیں بھر گئی ہیں
ناگ نے ایشیاء کو باغ میں
سوتے ہوئے ڈس لیا تھا

پہاڑی کی آخری شام

ایشیا کی اس ویران پہاڑی پر
موت ایک خانہ بدوش لڑکی کی طرح
گھوم رہی ہے
میری روشنی
اور انار کے درختوں میں
قزّاقوں کے چاقو چمکتے ہیں
اور سر پر وہ چاند ہے جو اس
پہاڑی کا پہلا پیغمبر ہے

اس پہاڑی پر فاطمہ رہتی ہے
اس کے کبڑوں میں وہ کبوتر ہیں
جو کبھی اُڑ نہیں سکتے
خُدا نے ہمیں ایک غار میں
بند کر دیا ہے اور ہمارے سروں پر
سیاہ رات جیسا پتھر رکھ دیا ہے

گھوڑے

مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم
کاہلی کے باغوں میں اس طرح
کِھلے ہوئے ہیں جیسے
ایک ٹہنی پر دو گلاب

چاند درختوں کے قریب نہیں ہے

دریا پر جھکی ہوئی شاخوں میں
پرندے سو رہے ہیں
وہ دیکھو پرندے سو رہے ہیں
دوسرے پرندے
جنگل سے ابھی واپس نہیں آئے
ہاں جنگل سے ابھی واپس نہیں آئے
شاید کسی بزرگ کی قبر پر
چہک رہے ہوں
مگر اس بزرگ کی قبر پر
جس کی دعا سے
درختوں میں پھول کھلتے ہیں

چاندنی میں
شکاری کی بندوق اور
درندوں کی آنکھیں بھی
چمکنے لگتی ہیں
اور ہوائیں بھی
دَف بجاتی ہیں
ہاں رات بھر دف بجاتی ہیں

ایک باغ

میں ایک باغ میں ننھی سی بندوق سے
چڑیوں پر فائر کرتا ہوں
چڑیاں اُڑ جاتی ہیں
دیکھو اس باغ میں
ابا جان کا بنگلہ کتنا خوبصورت ہے
اس بنگلہ کی سرخ کھپریل سے
ستارے چشمک کرتے ہیں
مگر اس باغ میں
چڑیوں اور تتلیوں کے سوا
کوئی نہیں آتا

دُوسرا باغ

میں شیطان کو کنول کے ایک پھول میں
بند کرنا چاہتا ہوں
تاکہ تم دیکھ سکو
شیطان کا چہرہ کنول جیسا ہوتا ہے
شیطان کہتا ہے
اُسے کنول نہیں
ایک لڑکی چاہیے
جو صبح کی طرح خوبصورت ہو
اور محراب کی طرح
خدا کی یاد میں جاگ رہی ہو

تیسرا باغ

اشتراکی اور امریکی سب اپنے اپنے
گھروں میں رہتے ہیں مگر ان کی خود کلامی
اس باغ میں ٹہلنے آتی ہے
اس کی بیوی گورکن میں چابی
بھر کے چلی جاتی ہے
دیکھو مینار کی خالی آنکھ میں گھنٹا بج رہا ہے
زلزلے معاشرے سے ڈر کر
اس مینار میں چھُپ جاتے ہیں
بالکنی پر موت مالکِ مکان سے
کرایہ وصول کرتی ہے

میں شرط نہیں ہاروں گا

جاؤ اس سے کہہ دو
وہ مجھ سے اعلیٰ نسل کے
گھوڑوں کی شرط باندھنا چاہتا ہے
میں اس سے
فرانسیسی عورتوں کی شرط
نہیں باندھ سکتا
بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں
پہاڑوں پر سورج چمکنے سے پہلے
چلے جائیں
اُس کے گھوڑے ہنہنا رہے ہیں
میں فرانسیسی عورتوں کو لے کر
کہیں اور جا رہا ہوں

ماں

میری ماں جنّت میں
خدا کا گیت گا رہی ہے
مگر میں اپنی ماں کو نہیں
پہچان سکتا کیونکہ اُس کے ساتھ
اور بہت سی خوبصورت عورتیں بھی
خدا کا گیت گا رہی ہیں

ایک پینٹنگ

محرابی درخت، ننگی عورتیں اور اُن کے
سینوں پر رکھے ہوئے
سرخ سیب!
مَیں اس پینٹنگ میں
اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں
مصوّر نے مجھے درختوں کے پیچھے
کہیں چُھپا دیا ہے
لیکن میں ان درختوں سے
ایک دن نکلوں گا

اور ان عورتوں سے کہوں گا
میں ہی تو وہ شخص ہوں
جس کا تم انتظار کر رہی ہو
لیکن مصوّر نے اپنی بیاگرافی میں
لکھا ہے
کہ وہ مجھے درختوں سے باہر نکلنے کی اجازت
کبھی نہیں دے گا

بچپسی گرل

میں ایک خیمے کی طرح خوبصورت ہوں
اور منکسر المزاج درختوں کے بیچ
رہتی ہوں
اور جانتی ہوں کہ محبّت
سرخ گھوڑیوں سے زیادہ
طاقتور ہوتی ہے
میں اپنی تلاش میں
ستاروں کی طرح ٹوٹتی رہتی ہوں

میرے بدن میں
پہاڑوں کے سلسلے
موروں کی طرح ناچتے ہیں
اور جب کوئی جھاڑی سرہلاتی ہے
میرے جسم میں ایک گلاب
سرخ بلبل کی طرح گاتا ہے

ایک بزدل کے مقبرے کے پاس

آخر یہ ڈھول کون بجا رہا ہے
ہاں مگر ایک بزُدل کے مقبرے کے پاس
دیکھو پام کے درختوں کے پاس
آسمان میں لوگ
کِس کو ڈھونڈ رہے ہیں
ایک بزدل کے مقبرے کے پاس
آخر یہ ڈھول کون بجا رہا ہے

المیہ کھیل کا ایک کردار

جب میں بچّہ تھا
روئی کے گالوں سے ڈرتا تھا
اب دشمن کی چالوں سے ڈرتا ہوں

میرے بچپن میں
آگ کی اطراف
دراوڑ لڑکیاں گیت گاتی تھیں
اور اب میں ایک ہوٹل میں
بینڈ بجاتا ہوں
اور لومڑی کی کھال سے
اپنا لباس سیتا ہوں

شکاری جنگل سے واپس آگئے ہیں

شکاری جنگل سے واپس آگئے ہیں
اور ملّاح سمندر سے
مگر میں ابھی اپنی روح کے سفر سے
واپس نہیں آیا
دن میں چاند
اور رات میں سورج
نظر نہیں آتا
مگر میں دِن میں بھی نظر آتا ہوں
اور رات میں بھی

للی کبھی سیاہ نہیں ہوتی
اور آنکھوں میں کاجل
کبھی اجلا نہیں ہوتا
مگر میں کسی کے غم میں سیاہ
اور اپنی روشنی میں
اُجلا نظر آتا ہوں

جب رات اپنے پردے
چاک کردیتی ہے اور
سورج اپنے جال بُن لیتا ہے
میرے ماتمی کپڑوں پر سفید آنسو
تم کو یاد کرتے ہیں

مائیکل انجیلو کی ایک رات

آدم کی پہلی آواز
ان پتھروں میں اب بھی
چمک رہی ہے جنھیں پہلی
بار میں نے اپنی سرزمین
میں دیکھا ــــــ میری سرزمین
ان برفاب جسموں سے آباد ہے
جن جسموں میں خوبصورت
آنکھیں نئی جنّت کی سفیر ہیں

ایک چینی نظم کا ترجمہ

اس باغ میں جس کا دروازہ مشرق کی طرف
کُھلتا ہے نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور
چڑیاں درختوں میں گھونسلے بنا رہی ہیں
میں نے چڑیوں سے سُنا ہے کہ سورج
اور چاند گردش میں رہتے ہیں اس لئے کہ
انھیں بیٹھنے کے لئے کوئی نرم جگہ نہیں ملتی

چینی شاعر: تاؤیوان منگ (۳۶۵ - ۴۲۷ء)

دوسری چینی نظم

آنگن میں ہر طرف گرد پھیل رہی ہے
اور ریشم کی سرسراہٹ تھم گئی ہے
دُور دُور تک قدموں کی چاپ سُنائی نہیں دیتی
ایک انبار کی طرف درختوں کے
پتے تیزی سے جارہے ہیں وہاں جاکر چپ
ہو جاتے ہیں۔ ان پتوں کے بہت نیچے
کسی کی دہلیز سے ایک بھیگا ہوا پتلا لپٹا
ہوا ہے

چینی شاعر: لیوشی کی نظم کا ترجمہ

سسلی کے سیب

خداوند کی روح آسمانوں سے اُتر رہی تھی
شیزرا نے سوچا اس کے بیٹے جلالی نے کہیں
یہ صلیب باہر تو نہیں پھینک دی کہیں اس نے یہ صلیب
زیتون کے درخت میں نہ لگا دی ہو،
کہیں اس پر کونپلیں نہ پھوٹ گئی ہوں
اس کے بچپن نے اُسے گھر کی بادشاہت
دینے کا وعدہ کیا تھا اور موت اب اس سے
کہہ رہی تھی میں تجھے آسمان پر ایک گھر دینا
چاہتی ہوں
شیزرا کا لڑکا جلالی اب بوڑھا ہو چکا تھا
مگر وہ اب بھی اردن کے پار بیابانوں کے
خواب دیکھتا تھا۔ وہ اب بھی اپنے جسم میں
ایک خانہ بدوش کی روح چھپائے پھر رہا تھا

اس کے ساتھی اس سے کہہ رہے تھے

پاکبازوں کے پیلے پیلے اجلے اجلے دریاؤں
میں اس طرح تیرو جیسے چینی تیرتے ہیں۔ اونٹ
کے اون کی پوشاک اور جنگلی شہد لے کر
دریاؤں کی طرف جاؤ تمھیں کھانے کے لئے
ٹڈیاں اور سونے کے لئے درختوں کی چھاؤں
خود ہی مل جائے گی۔ جنگلوں کی آگ تمھارے لئے
کافی ہے
وقت تمھارے وجود کا گیہوں اپنی بوریوں
میں رکھ لے گا اور تمھاری بھوسی اس آگ
میں جلا دے گا جو کبھی بجھتی نہیں
اندھیرے میں جلالی کو دریا کے پار روشنی
نظر آئی اتنی بڑی روشنی جیسے سورج جنگل کی
آگ بن گیا ہو۔ وہ سوچنے لگا مجھے اپنی ماں
کی طرح بانس کا مکان نہیں بنانا چاہیے
بحرِ روم کی ایسی چٹانوں پر رہنا چاہیے جہاں
ہوائیں اور سمندر کے طوفان نہاتے ہیں

جلالی اردن کے پار ایک کشتی میں
بیٹھ کر اپنے آبائی وطن کی طرف جانے لگا۔
ایک مرغ کی بانگ سے دوسرے مرغ کی
بانگ تک صدیاں گزرنے لگیں

چراگاہوں میں چرتے ہوئے سور اُسے اچھے
لگے اور ان سے بھی اچھے وہ مرغ تھے جو کسانوں
کی دیواروں پر بانگ دے رہے تھے۔ پرندے
آسمانوں میں گھوم رہے تھے اور کبھی کبھی جھیل کے منجمد
پانی پر اُتر آتے تھے اسے اپنی کشتی چھوٹی لگی
سمندروں کو اس احمق چوہے پر غصہ آیا۔ جلالی
ننگا تھا۔ کاہنوں نے اسے اٹھا کر سمندروں میں
پھینک دیا۔

جلالی سوچ رہا تھا زمین دُور نہیں ہے
سسلی کے ریستورانوں میں گیہوں کی روٹی اور
سیب مل جائیں گے وقت سسلی کے سیبوں سے
زیادہ جلد پکتا ہے

سُپر کیٹ

میرے گھر کے دروازے پر
اک اندھی بِلّی رہتی ہے
جو مجھ سے کہتی ہے
میں آؤں میں آؤں
رات گرج گرج کر برستی ہے
روشندان میں گوریّا
سپنے دیکھتی ہے
گھر کے آنگن میں سمندر ہے
اور سمندر میں سورج کی گگری
ڈوب رہی ہے
رات اتنی بھیانک ہے
گھر کی دیواروں پر
کانچ کے ٹکڑے
اور ستاروں کی آوازیں پہرا دیتی ہیں

جھینگر تلنے کی خوشبو
کنْول سے کہتی ہے
گوتم اندر آنے والا ہے
نروان کے ماننے والوں سے
کہنے والا ہے :
برگد کی چھاؤں
لالچ کی دھوپ سے بہتر ہے
احمق میرے ساتھ بھی رہ کر
احمق رہتا ہے
چمچہ کیا جانے شوربہ کیسا ہوتا ہے

رات اتنی بھیانک ہے
ہاؤزنگ کالونی سے
سَروں کے میناروں کی
کالی کالی آوازیں آتی ہیں
گھر کی بتیاں بجھ جاتی ہیں
بچّے ڈر جاتے ہیں

رات گرج گرج کر برستی ہے

روشندان میں گوریّا

سپنے دیکھتی ہے

خانِ اعظم کا سایہ

دیواروں پر دوڑتا ہے

گھر کی بتّیاں جل جاتی ہیں

اور مسولینی کی باہنوں میں

اٹالین لڑکیاں جسٹے کو گھورتی ہیں

رات برہنہ ہاتھوں سے

میرے گھر کی دیواروں کو پیٹاتی ہے

ڈریسنگ روم میں

رومن جنرل آتے ہیں

کلوپیٹرا کے خون میں

خواہش دوڑتی ہے

انتونی عشقِ پیچاں کی بیلوں میں

سوتا ہے

آتشدان کی گرمی
ممی کے مُردہ ناخنوں میں
سو جاتی ہے
ٹاملٹ میں صوفیہ
اپنے برہنہ جسم سے کھیلتی ہے
ٹیلی ویژن پر
جاسوسی ہیرو کے پیچھے
کتّے بھاگتے ہیں
چاند پہ جانے والا
پہلا ہیرو ڈنر کھاتا ہے
لائیکا ناچتی رہتی ہے
کچن سے کافی کی خوشبو
آتی رہتی ہے
میرے گھر میں وہ بچّے بھی
رہتے ہیں جو آنے والی
سینکڑوں صدیوں میں
پیدا ہوں گے

میرے گھر کے دروازے پر
اک اندھی بِلّی رہتی ہے
جو مجھ سے پوچھتی رہتی ہے
کیا تیرے گھر کے روشندان میں
گوریّا سپنے دیکھتی ہے
میں آؤں، میں آؤں
کیا تیرے گھر میں چوہے رہتے ہیں
میں آؤں، میں آؤں

مجذوب

میرا مرشد
سورج کو ایک کالا پیرہن سمجھتا ہے
ایسا کالا پیرہن
جسے اس نے اُتار کر
آسمانوں میں پھینک دیا ہے

پرندے اور رات

یہ چاند نہیں ہے
ایک درندے کی آنکھ ہے
جو ہر رات قبر سے باہر
نکل آتی ہے
اور دیکھتی ہے
کہ درختوں میں گھونسلے
روشن ہیں کہ نہیں

آسمان سیاہ ہو چکا ہے

ہم ایک اطالوی گاؤں میں آگئے ہیں
جہاں آسمان سیاہ ہو چکا ہے اور
مسولینی کی تقریریں اخروٹوں کی شکل
میں بک رہی ہیں!

مورننگ کی ایک تصویر

میں حُسنِ مطلق کی کرسی پر
بیٹھ کر
ایک گداگر سے
شہر کا افسانہ سُن رہا ہوں

آسمان اور غار

محبت گھاس کی طرح اُگتی ہے
اور ہر موسم کا مقابلہ کرتی ہے
ہم ہر آنسو کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں
اور ہر صبح سورج کے ساتھ پھر نکل آتے ہیں

چڑیاں اس کی بہترین مثال ہیں

علاقائی تنگ نظری سے
بچنا چاہیئے
چڑیاں اس کی بہترین مثال ہیں

ماخوذ

چڑیا گھر

بچے تنہا، بہادر اور خوبصورت ہوتے ہیں،
ہماری زندگی کا آغاز کھیل سے ہوتا ہے لوگ آرائش
کا سامان نہیں کھلونے خریدتے ہیں، شریر بچے
سیاست میں حصہ لیتے ہیں اور معصوم بچے ان
کا کھیل دیکھتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ بڑوں کی
باتیں سُننا چاہیئے یا اس بچے کا ساتھ دینا چاہیئے
جو ہمارے خون میں انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ یہ مجھ
سے ایک معصوم بچے نے پوچھا اور جواب کا انتظار
کئے بغیر اُس تتلی کے پیچھے بھاگنے لگا جو اتفاقاً
کھڑکی سے کمرے میں آگئی تھی میں سوچنے لگا کیا سچ مچ
تتلی پکڑنے والے بچے اچھے نہیں ہوتے۔ منّو اچھا
لڑکا نہیں ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ منّو نے
پلٹ کر مجھ سے پوچھا ابو! کیا شیر کے بچے چڑیا گھر
میں بھی خوش رہتے ہیں۔

شہسواروں کے نام

زرتشت نے خدا سے کہا۔ اے اہورامزدا
اے میرے آقا میرے مالک میں اُن دس گھوڑیوں کا
انعام کیسے حاصل کروں جس کی رہنمائی ایک گھوڑا کر رہا
ہے، یعنی زرتشت کہہ رہے تھے کہ اے میرے آقا!
میرے مالک میں اپنے حواس کو روح کے کنٹرول میں
کیسے لاؤں ایسی روح کی روشنی میں جو تیرے نور سے
روشن ہو۔

ویدوں نے کہا تھا کہ صبح قربانی کے گھوڑے
کا سر ہے سورج اس کی آنکھ اور ہوا اس کی
سانس ہے زمین اس گھوڑے کا سُم ہے اور رات
دن اس کے پاؤں ہیں۔

میں جب آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو
یوں لگتا ہے۔ جیسے گھوڑا بڑے غرور سے کُود رہا

ہے۔ اچھل رہا ہے۔ کھروں سے زمین کو زخمی کر رہا ہے،
لگام اپنے دانتوں میں پیس رہا ہے آہ یہ گھوڑا جو
اس دھرتی کا بوجھ اس دھرتی کا دُکھ اُٹھائے ہوئے
ہے۔

مگر یہ سلاطین ٹٹو پر بیٹھے ہوئے اس طرح
نظر آتے ہیں جیسے اب گرے تب گرے، زمانہ بھی
ایک گھوڑا ہے اور بزدل کہتے ہیں کہ خوشامد اس
گھوڑے کی زین ہے بزدل کہتے ہیں کہ گدھے کو بھی
اصطبل کی آبرو سمجھو۔

بزرگ گھوڑوں کا احترام کرو یا نہ کرو ان
کے سامنے جھک ضرور جاؤ، ہر طرف معاشی، سماجی
اور سیاسی گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ وائسرائے بھی
گھوڑا گاڑی میں بیٹھا کرتا تھا مگر اس گھوڑا گاڑی
میں نمائشی گھوڑے زیادہ ہوا کرتے تھے ارجن
کے رتھ میں بھی کئی گھوڑے تھے مگر یہ سچ مچ
کے گھوڑے تھے۔ خرِ عیسیٰؑ آج کل کے گھوڑوں

سے زیادہ محترم تھا۔ ہم اب بھی خرِ عیسیٰؑ کی عظمت
سے محروم ہیں۔ گھوڑوں کے رہنما کہتے ہیں گھوڑوں
کو منزل اور سواری کی تفصیل نہ بتاؤ ان پر ہنستے
کھیلتے چڑھ جاؤ۔ گھوڑوں پر ظاہر نہ کرو کہ ان کی
سواری آپ کے لئے بہت اہم ہے ان کے سامنے
باتیں کم کرو صرف ٹخ ٹخ کرتے رہو، کبھی کبھار
چابک کی آواز بھی کارگر معلوم ہوتی ہے۔ ہاں
کھلونوں کے گھوڑوں پر کبھی سوار نہ ہوں یہ
نمائشی گھوڑے ہوتے ہیں ان پر سوار ہلتا رہتا
ہے گھوڑا آگے نہیں بڑھتا ہاں یاد رکھو ہر گھوڑا
سچا گھوڑا نہیں ہوتا۔ جو سچے گھوڑوں، سرکس
کے گھوڑوں اور ترائے کے گھوڑوں کا فرق جانتا
ہے وہی گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہے۔ یقینِ محکم
سے گھوڑے ملتے ہیں اگر آپ کو یقینِ محکم ہے تو
ہر طرف گھوڑے دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے کالے

بھورے چتکبرے ہر قسم کے گھوڑے، سستے، قیمتی خاموش، کم سخن، ہنہناتے ہوئے گھوڑے۔ سارے گھوڑے ایک دوسرے کو گھوڑا سمجھتے ہیں دوسری بات یہ کہ گھوڑے کسی کی ملکیت نہیں ہوتے ہر گھوڑا آپ کا گھوڑا ہے کیونکہ خدا کا گھوڑا ہے۔

زرتشت نے کہا اے میرے آقا اے میرے مالک میں اپنے حواس کو اپنے ذہن کے کنٹرول میں کیسے لاؤں؟ ایسے ذہن کی روشنی جو تیرے نور سے روشن ہو ـــــ میں زرتشت کا یہ قول دہراتے ہوئے اپنے نفس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور پھر ایک زمانے کے بعد آج اپنے گھر آ گیا ہوں۔

سرو کے ایک درخت کا خواب

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ خدا نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو اس نے فرشتوں سے کہا میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ انسان زبان رکھتا ہے آوازوں سے جانور صرف مخصوص چیزوں کے بارے میں اشارے کرتے ہیں، ان کی آوازوں سے علامتیں مراد نہیں ہوتیں۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اب گرجنے بھی لگے۔ بوندا باندی بھی ہونے لگی۔ لیکن ماسٹر صاحب کی گفتگو جاری تھی۔ کھڑکی سے کبھی کبھار سرد ہوا کا جھونکا بھی آجاتا تھا مگر ماسٹر صاحب موسم سے بے خبر تھے ان کا لیکچر جاری تھا وہ کہہ رہے تھے زبان کا علم صرف انسان کو حاصل ہے۔ ایک نوجوان نے پوچھا۔ کیا غور و فکر انسان ہونے کی علامت نہیں ہے۔ کیوں نہیں؟ ماسٹر صاحب نے کہا آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے

کہ آپ زبان کے باہر سوچ بھی نہیں سکتے۔ سوچنے کا عمل کیا ہے خواب دیکھنا، ہاں شیخ چلّی کا خواب نخواب کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کو جنم دیتا ہے سوچ کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کو جنم دیتا ہے، منتشر خیالوں کی آمدورفت کو ہم سوچ نہیں کہہ سکتے، سوچ کا ایک مرحلہ دوسرے مرحلے سے وابستہ ہے اس طرح فکر ایک زنجیر بن جاتی ہے خیال حرکت کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے مگر ماسٹر صاحب نے کہا حیرت کی بات یہ ہے جس مقصد کے لئے آپ غور وفکر کرتے ہیں غور وفکر اُسی مقصد کے تابع ہو جاتا ہے۔

کلاس میں موجود طالب علموں میں سے کچھ اونگھنے لگے تھے کچھ سونے کے قریب تھے انھیں دیکھ کر ماسٹر صاحب نے کہا میں نے تم سے کہا تھا کہ خواب بھی سوچ ہی کا ایک حصّہ ہوتے ہیں۔ بچّو! میں تمھیں حکم دے کر سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتا، اصل میں سوچ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہمارے سامنے کوئی مسئلہ آتا ہے یہی مسئلہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اکثر لوگ بے صبری کی وجہ سے نتیجہ تک پہونچنے
میں دیر نہیں کرنا چاہتے۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو
جانتا ہوں جو انٹلکچول سوچ اور جستجو سے گھبراتے ہیں اور
سچ کی حالت میں گرفتار رہنے کو بہت بُرا سمجھتے ہیں یہ
لوگ نہیں جانتے کہ سچے خیال تک پہونچنے کے لئے
شک کی حالت میں دیر تک رہنا ضروری ہوتا ہے۔
ہمارے ماسٹر صاحب مشہور نقاد تھے اور شاعری
بھی کرتے تھے ایک لڑکے نے ہمّت کر کے پوچھا سر آپ
کسی نتیجے پر پہونچے یا خدانخواستہ ابھی شک میں
گرفتار ہیں پھر یہ کہا کہ خدا کون ہے خدا کیا ہے خدا کہاں
ہے ناول کسے کہتے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے کہا

ناول بنیادی طور پر اپنے عہد کی زندگی کو
پیش کرتا ہے اور شاعری دو غیر مماثل چیزوں میں
مشابہت تلاش کرنے کا نام ہے۔ جیسے جرمنی کا ایک

مشہور شاعر گوئٹے کہتا ہے
شمالی پہاڑوں کی بلندیوں پر
جہاں تیز ہوائیں چل رہی تھیں
سرو کا ایک تنہا درخت
برف کی سفید تہوں کے نیچے سو رہا تھا
سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا۔
کھجور کے درخت کا خواب کہ دور
مشرقی سرزمین میں
جلتی ہوئی ریت کے ایک ٹیلے پر
کھجور کا ایک درخت تنہا اور خاموش
ماتم گسار تھا۔

تو سوال یہ ہے کہ دو غیر مماثل چیزوں میں
مشابہت پیدا کرنے سے ہمیں اتنی خوشی کیوں ملتی ہے
شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کے
دو ہی طریقے ممکن ہیں ایک تو کائنات میں وحدت
تلاش کرنا دوسرے اس میں اور اس کے خالق میں وحدت
کی تلاش یا پھر اسے مالک اور اپنے آپ کو غلام سمجھنا۔

شاعری ان دونوں نقاطِ نظر کے اتصال کا نام ہے۔ شاعری کا شعلہ ان دونوں نقاطِ نظر کے اتصال سے بھڑکتا ہے۔

گوئٹے سچ کہتا ہے کہ انسان کی روح پانی کی طرح ہوتی ہے۔

آسمان پر بادل گھر چکے تھے، بارش ہونے لگی۔ ماسٹر صاحب کے اشارے پر کلاس میں لڑکوں نے روشنیاں جلادیں ماسٹر صاحب نے کہا گوئٹے سچ کہتا ہے انسان کی روح پانی کی طرح ہوتی ہے یہ پانی آسمانوں سے اُترتا ہے اور آسمانوں ہی کی طرف جاتا ہے اور پھر آسمانوں ہی سے زمین کی طرف آتا ہے، دریاؤں کی موجیں چٹانوں سے ٹکراتی ہیں۔ پانی کا راستہ پتھر روکتے ہیں لیکن یہ پانی پہاڑوں سے وادیوں میں اُتر آتا ہے۔ پانی نشیب میں جاتے سے پہلے وادیوں میں رینگتا ہے اور پھر نشیب میں پہنچ کر جھیل بنا دیتا ہے لیکن اِس جھیل میں آسمانوں کی بلندی چمکتی ہے۔ یہ جھیل آسمانوں کو آئینہ دِکھاتی ہے۔

یہ سچ ہے ہوا محبت کرتی ہے لیکن انسان کی
روح پانی کی طرح ہوتی ہے اور انسان کی تقدیر ہوا کی
طرح۔ میں بھی اس کلاس میں موجود تھا بارش تیز
ہو رہی تھی میں نے ماسٹر صاحب سے کہا مجھے ہائنے کی
نظم سرو کا خواب پسند آئی میں بھی کسی تپتے ہوئے
ریگستان میں کھجور کے درخت کی طرح جل رہا ہوں۔

مقدّس نیل کے پانچ مگرمچھ

مصری کہتے ہیں کہ مقدّس نیل کے پانچ مگرمچھوں
نے آسمان پیدا کئے اور انسان' مہامن ونتر' کے آغاز میں
برہما ایک سنہرا انڈا دیتا ہے جو ایک عظیم دائرے کی صورت
میں نمودار ہوتا ہے۔ مور اور ہرن مقدّس علامتیں
ہیں دائرہ سورج دیوتا کی علامت ہے اور مرکز خدا
کی وحدت کا اعلان

چینی کہتے ہیں کہ جب کائنات میں کچھ نہیں تھا
تو ایک عظیم مقدّس انسان تھا جس نے دوزخ اور
جنّت پیدا کئے۔ اس عظیم انسان کے رونے سے دریائے زرد
پیدا ہوا۔ جب اس نے سانس لی تو ہوائیں چلیں

اور جب وہ بولا تو بادل گرجے اور جب اس نے پلٹ
کر دیکھا تو بجلی چمکی اس کا موڈ بہتر ہوا تو موسم اچھے
ہو گئے وہ غمگین ہوا تو بادل چھا گئے اور جب وہ مَرا
تو اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اس کی آنکھیں
چاند اور سورج بن گئیں اس کا دایاں ہاتھ ہنگ پہاڑ
اور پاؤں مغرب میں ہُوا کا کوہستان۔

ایرانی کہتے ہیں کہ آدم مرا تو اس کی روح سے
سونا نکلا، اُس سے روشنی نکلتی تھی ہاں چینی کہتے
ہیں کہ پہلا انسان پودوں کی طرح تھا اُس پر پتّے
لپٹے ہوئے تھے۔

نیا انسان کہتا ہے شاعری انسانی ذہن سے
اس طرح پیدا ہوتی ہے جیسے زمین سے شجر پیدا ہوتے
ہیں اور ثمر لاتے ہیں، زمین اس کی نشوونما میں حصّہ
لیتی ہے، توانائی اسے شعور تک لاتی ہے لیکن شاعری
شعور سے آزاد ہوتی ہے شعور شاعری کو قید نہیں کر سکتا۔

شاعری ایک ازلی گونج ہے ایک نیا امکان

ہماری روحوں میں دریا پڑے رہتے ہیں شاعری

ان دریاؤں کا طوفان ہے، جب ان خشک دریاؤں میں

زندگی کا پانی آتا ہے تو یہی خشک دریا طوفان بن جاتے

ہیں سیلاب بن جاتے ہیں ہم ایک فرد نہیں پوری

انسانیت بن جاتے ہیں پورا جنگل بن جاتے ہیں سورج

دیوتا بن جاتے ہیں، آدم بن جاتے ہیں اور جان جاتے

ہیں کہ انسان وہ ہے جس پر پتّے لپٹے ہوتے ہیں جس

سے روشنی نکلتی ہے اور مقدّس نیل کے پانچ

مگر مچھ اُسے سجدہ کرتے ہیں!

چھتری، سمندر اور نئے فنکار

کاش ہم جھینگروں کی

آواز سے بادبان بنا سکتے اور چاند سے کہہ سکتے بیوقوف

ہماری آواز نہ سُن دیکھ اِس ریت پر ایک لڑکی ہماری

روحوں پر سپنے بُن رہی ہے۔ جانوروں

سے گذرتے ہوئے لمحے بن باس لے رہے ہیں اور وقت

ایک بوڑھے گیدڑ کی طرح اونگھ رہا ہے جھاڑیاں الجھ

رہی ہیں اور منہ پھٹ کتّوں کی طرح ہماری سچّائیاں

ہمارے ساتھ چل رہی ہیں

ہم اپنے آپ کو ہُوٹ کرتے ہیں

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کاش ہم آبی پرندوں کی

طرح کسی ایسی جگہ جا سکتے ہیں جہاں اداس مینڈک

ہماری آواز نہ سنتے، ہمارے ساتھ مرغابیاں ہوتی ہیں
اور بٹیر۔ رنگ بدلتے ہوئے گرگٹ ہمیں ہر طرف سے
گھیرے رہتے ہیں۔ ہم گھوڑسواری سے واقف ہیں۔
گھوڑوں کی تربیت کرنا بھی جانتے ہیں مگر ہمارے
گھوڑے صرف اپنے شہر کی گلیوں میں دوڑتے رہتے
ہیں ہم وہ خلا ہیں جو حروف کے درمیان زندہ رہتا ہے۔
جب ہم اپنے گھروں میں ہوتے ہیں تو ہمارے
دلوں کی روشنی گل ہو جاتی ہے اور جب ہم باہر نکلتے
ہیں تو سڑک پر زمستاں کی رات گھوڑا گاڑی کے
نیچے سوئی ہوئی ملتی ہے۔ رات ہماری آہٹ پا کر
جاگ اٹھتی ہے اور کونے والی عمارت کے شوروم
میں گھس جاتی ہے تاجر ہمیں گھوڑا گاڑی سے اتار دیتا
ہے اور خود گاڑی میں بیٹھ کر چینی زبان کے ایک افسانہ نگار
کی کہانی پڑھنے لگتا ہے۔

ہم اپنے آپ کو ہوٹ کرتے ہیں جب
ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو شاعری کے کھنڈروں میں پھر چڑیاں

اپنے گھونسلے بنا رہی ہیں۔ جیسے ان کھنڈروں میں ابھی ایک آدھ مکان باقی ہے زندگی سرکس کی موٹر سائیکل کی طرح اندھے کنوئیں میں چکّر لگاتی رہتی ہے۔ موٹر سائیکل کا سایا بھی موٹر سائیکل کے ساتھ چکّر لگاتا رہتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لفظ برستے ہیں گرجتے بھی ہیں۔ کبھی ان میں رِم جھم کی کیفیت بھی ہوتی ہے اور کبھی ان سے اَدلے بھی بن جاتے ہیں مگر ہم ہمیشہ اپنی عظمت کی چھتری لگا کر گھومتے ہیں کیونکہ ہمارے لفظ کبھی آگ نہیں بنتے ___ ہمارے دوستوں کو ہماری باتوں میں معانی نظر نہیں آتے جیسے دُور سے درختوں میں چڑیوں کے گھونسلے نظر نہیں آتے حالانکہ ان پرندوں کی آواز انھیں روک لیتی ہے اور کہتی ہے دیکھئے صبح ہو رہی ہے۔

تصحیح نامہ

صفحہ ۲۱ : دوسرا مصرعہ یوں ہے

باتیں مکے والوں کی اور قصے بنارس والوں کے

صفحہ ۲۱ : آخری مصرعہ یوں ہے

میرے لئے اُس دیس کی یادیں اب بھی ناچنے آتی ہیں

صفحہ ۵۱ : پہلا مصرعہ یوں ہے

رونے والے بادل

صفحہ ۵۲ : پانچواں مصرعہ یوں ہے

رونے والے بادل

صفحہ ۷۹ : چھٹا مصرعہ یوں ہے

جو شہر گل میں ملا ہے عجیب آدمی ہے

صفحہ ۸۴ : پہلا مصرعہ یوں ہے

لپٹ کے سو گئی ویران بستیوں سے بہار

صفحہ ۹۳ : پہلا مصرعہ یوں ہے

فضا اداس تھی اتنی، اجاڑ ایسی تھی

صفحہ ۹۳ : پانچواں مصرعہ یوں ہے

کبھی کھلا تو کبھی بند ہو گیا آخر

صفحہ ۱۴۰ : چھٹا مصرعہ یوں ہے

پھر ایک سفر پہ جا رہا ہوں

صفحہ ۱۴۱ : ساتواں مصرعہ یوں ہے

ہاں کیا اس سیلاب کے اندر

صفحہ ۱۸۸ : نظم کی پہلی لائن یوں ہے

میں حُسنِ ازل کی کرسی پر